کشمیر: ہمالیہ کا جہنم زار

سکاٹ کیریر*

ترجمہ: سلمان طاہر

کشمیر اولیاء، متقی اور پرہیزگار بزرگوں، شاعروں اور فلسفیوں کی طویل تاریخ کا نام ہے، جنہیں اس سرزمین کے خوبصورت پہاڑ اور وادیاں، موسم سرما کی برفباری، موسم گرما کی سرسبزی و شادابی، نیو انگلینڈ کا سا موسم خزاں اور گھاٹیوں میں بہتے ہوئے چشمے اپنی جانب کھینچتے چلے آئے تھے۔ مہاتما بدھ نے مراقبہ اور مذہبی زندگی گزارنے کے لیے کشمیر کو بہترین جگہ قرار دیا تھا۔

مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقبرے والی گلی سے نکل کر آپ کسی بھی سمت سو گز تک بھی جانا چاہیں تو راستے میں ریت کی بوریوں کے بنکرز دیکھیں گے جن کے پیچھے بھارتی سیکورٹی فورسز کے جوان راہ گیروں پر مشین گنیں تانے کھڑے ہیں۔ پکی گلیوں میں دستی بموں کے پھٹنے سے شگاف پڑ گئے ہیں۔ گلی کی دونوں جانب جلی ہوئی اور ویران خالی عمارتیں ہیں۔ سورج غروب ہوتے ہی گلیاں سنسان ہو جاتی ہیں صرف آوارہ کتوں کے غول پھرتے نظر آتے ہیں۔ کوئی انسان باہر نکلنے کا خطرہ مول نہیں لیتا۔ اور اب تو لوگ بند دروازوں کے پیچھے اپنے گھروں میں بھی محفوظ نہیں۔ کتنی ہی بار چھ چھ بارہ بارہ افراد گھروں میں سوتے مشین گنوں سے بھون دیے گئے۔ گزشتہ سالوں میں تقریباً بیس ہزار سے پچاس ہزار * تک کشمیری قتل کیے جا چکے ہیں۔ کشمیر دنیا کا خوبصورت ترین خطہ ہے۔ دنیا میں اور بھی بہت سے خوبصورت خطے ہیں لیکن شاید ہی کوئی خطہ اتنا اداس اور غمزدہ ہو۔

کشمیر کا حالیہ جھگڑا اسی دن شروع ہو گیا تھا جب پاکستان اور بھارت تقسیم ہند کے باعث وجود میں

---

* Scott Carrier, "A Himalayan Hell", *Esquire*, Jan. 1999, Vol. 131, pp. 50-55

* ایشیا واچ اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کی ۱۹۹۹ء کی رپورٹ کے مطابق یہ تعداد اب ۶۵ ہزار سے زیادہ ہے۔

آئے۔ ۱۹۴۷ء میں برطانیہ کو جب یقین ہو گیا کہ ہندوستان میں ان کے لیے مسائل کی دلدل میں دھنسنے کے سوا کچھ نہیں رہا تو اس نے جلد از جلد یہاں سے نکل جانے میں عافیت سمجھی۔ گاندھی انگریزوں کے نکل جانے کے بعد متحدہ ہندوستان میں جمہوری حکومت کے خواہاں تھے لیکن مسلمان جو اقلیت میں تھے بحیثیت قوم الگ رہنا چاہتے تھے۔ انگریز مصلحتوں اور اخلاق کے تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے برصغیر کو تقسیم کر کے رخصت ہو گئے، اور کشمیر کو جس کی آبادی مسلمان تھی اور حکمران ہندو، اپنے مسئلے کا حل خود تلاش کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر پاکستان سے فوجی کشمیر میں داخل ہو گئے۔ یہ لوگ سری نگر سے چار میل کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے کہ بھارت نے ایک بریگیڈ بھیج کر انہیں پیچھے دھکیل دیا۔

۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعہ جنگ بندی کروا دی اور وعدہ کیا کہ اہل کشمیر کو اس بات کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے گا کہ وہ بھارت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ۔ پچاس سال گزر چکے ہیں اور بھارت اور پاکستان کے درمیان تین جنگیں بھی ہو چکی ہیں لیکن کشمیریوں کو اپنی رائے کا اظہار کرنے کے لیے ووٹ دینے کا موقع نہیں دیا گیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ پاکستان کے پاس کشمیر کا ایک تہائی اور بھارت کے پاس دو تہائی علاقہ ہے، درمیان میں ایک غیر واضح لائن آف کنٹرول ہے جہاں دونوں ملکوں کی فوجوں میں تقریباً مسلسل تصادم اور جھڑپوں کی کیفیت رہتی ہے حتیٰ کہ ہمالیہ کی انتہائی بلندی پر، سطح سمندر سے تقریباً بیس ہزار فٹ بلند سیاچن گلیشئر پر بھی یہی کیفیت ہے۔

۱۹۸۹ء میں یہ سرحدی جھگڑا خانہ جنگی میں تبدیل ہو گیا۔ کشمیری نوجوان افغانستان اور پاکستان سے اسلحہ اور گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کرنے کے بعد حق خود ارادیت حاصل کرنے کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے پولیس اسٹیشنوں کو دھماکوں سے اڑانا، سرکاری اہلکاروں کو اغوا کرنے کے بعد قتل کرنا اور ہندوؤں کے گھروں کو جلانا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں دو لاکھ چالیس ہزار ہندوؤں کو بھارت کے جنوبی حصے میں پناہ لینا پڑی۔ ابتدا میں اہل کشمیر نے جنگجوؤں کو رقم، خوراک اور پناہ دی۔ وہ سری نگر اور اس کے قرب و جوار میں مسلح ہو کر اپنے کارناموں پر فخر کرتے نظر آتے تھے۔

بھارت نے جواباً کشمیر پر تسلط قائم رکھنے کے لیے اڑھائی لاکھ * فوجی کشمیر میں تعینات کر دیے۔ گویا ایک جنگجو کے مقابلے میں ساٹھ فوجی۔ بھارتی فوجیوں نے بہت سے جنگجو رہنماؤں کو قتل کیا اور کئی ایک کو پابند سلاسل کر دیا۔ وہ کرفیو نافذ کرتے، گھروں کی تلاشی لیتے اور جنگجوؤں کو گرفتار کرتے اور قتل کر دیتے، ہر اس کشمیری کو بھی گرفتار کر کے قتل کر دیتے جس پر جنگجوؤں کا ساتھی ہونے کا ذرا بھی شبہ ہوتا، عورتوں پر مجرمانہ حملے کرتے اور گھروں کو جلا کر زمین بوس کر دیتے۔

۱۹۹۲ء تک زیادہ تر کشمیریوں نے جنگجوؤں کو پیسے، خوراک اور پناہ دینی بند کر دی تھی لیکن جنگجوؤں نے یہ سب کچھ کسی نہ کسی طرح خود سے حاصل کرنا شروع کر دیا۔ بعض اوقات وہ گھروں کو جلا دیتے اور لوگوں کو قتل کر دیتے۔ اب انہیں قتل کا لائسنس مل گیا تھا۔ اب وہ جہاد کر رہے تھے۔ ہر وہ شخص جو ان سے اختلاف کرتا اللہ کا دشمن تھا۔ چنانچہ اب کشمیر کے لوگوں کو دو باتوں میں سے ایک کو چننا تھا۔ جنگجوؤں کا ساتھ دیں اور بھارت کی فوج کے ہاتھوں مصائب جھیلیں یا پھر بھارت کی فوج کا ساتھ دیں اور جنگجوؤں کے ہاتھوں مشکلات کا سامنا کریں۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ مکمل تباہی سر پر منڈلانے لگی ہے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان پچاس سال سے چلے آنے والے اس جھگڑے کا براہ راست نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دونوں ملک ایٹمی قوت بن گئے ہیں۔ انجام کار اب کوئی کشمیری اپنے بھائی حتیٰ کہ اپنے بیٹے پر بھی اعتماد نہیں کرتا۔ خوف کے اس عالم میں تہذیبی عمارت منہدم ہوتی جا رہی ہے۔

میرا ڈرائیور ماجد مجھے شہر کا ایک پڑوسی علاقہ دکھانے لے جاتا ہے۔ گلی میں دکانیں ہیں لیکن ساری بند ہیں۔ دو دن پہلے دکانوں کے بالکل قریب سیکورٹی فورسز کے ایک بنکر پر جنگجوؤں نے دستی بم پھینکا تھا جو اچٹ کر سڑک پر جا گرا اور پھٹ گیا۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا لیکن بھارتی سیکورٹی فورسز کے آدمی چیختے چلاتے ہوئے ایک ایک گھر میں گھس گئے اور گھر والوں پر ٹوٹ پڑے۔ مار مار کر ان کے چہرے زخمی کر دیے، بندوقوں کے بٹوں سے ان کی ہڈیاں توڑ ڈالیں۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے زخم دکھائے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک اسی سالہ بوڑھے کو ہسپتال داخل کروانا پڑا۔ یہ لوگ غمگین اور خوف زدہ ہیں اور دہشت زدہ ماحول کے باعث پریشان حال ہیں۔ تاہم دکانوں کے باہر بم پھٹنے کے بعد گھروں میں ان پر ہونے والا

---

* اس وقت ۶ لاکھ سے زیادہ فوجی کشمیر میں تعینات ہیں۔

تشدد ان لوگوں کے لیے کوئی بڑا سانحہ نہیں ہے۔ ان کی خوش قسمتی ہے کہ وہ بچ گئے۔ اس قسم کے واقعہ کے بعد لوگوں کا قتل تو یہاں معمول بن چکا ہے۔

ماجد مجھے حزب مخالف کے بعض سیاسی رہنماؤں کے گھر لے جاتا ہے۔ یہ سب بنیاد پرست مسلمان رہنما ہیں۔ ہر ایک نے مجھے یہی بتایا کہ وہ اسی طرح کے حق خودارادیت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں جس طرح کہ امریکہ نے دوسو سال پہلے برطانیہ سے آزادی کے لیے کی تھی۔ ماجد مجھے یٰسین ملک سے جیل میں ملاقات کروانے لے گیا۔ یٰسین ان چار ابتدائی باغیوں میں سے ایک ہے جو عنفوانِ شباب میں اسلحہ کی تربیت حاصل کرنے کے لیے پاکستان گئے تھے اور پھر واپس آ کر انہوں نے ہزاروں دوسرے نوجوانوں کو اپنے نقشِ قدم پر چلنے کے لیے آمادہ کیا۔ پھر اسے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس وقت وہ بتیس سال کا ہے اور جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کا چیئرمین ہے جو متعدد علیحدگی پسند تنظیموں میں سے ایک تنظیم ہے۔ یٰسین کو کشمیری تمام دوسرے رہنماؤں سے زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس پر اعتماد کرتے ہیں۔

میں نے یٰسین سے اس کی کال کوٹھڑی میں ملنے کی درخواست کی لیکن پولیس کا اصرار تھا کہ وہ اسے مجھ سے ملانے کے لیے جیل آفیسر کے کمرے میں لائیں گے۔ یٰسین بنچ پر خمیدہ ہو کر، دیوار کے ساتھ پشت لگا کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے اس میں بیٹھ سکنے کی طاقت ہی نہیں ہے۔ اس نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں نے معذرت چاہی کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ کو دل کی تکلیف ہے اور میری وجہ سے آپ کو اپنی کال کوٹھڑی سے چل کر آنا پڑا ہے۔ ''مجھے سہ پہر کو جیل سے رہا کیا جا رہا ہے، ملنا ہے تو میرے گھر پر آ یئے'' اس نے کہا۔

ہم نے یٰسین کی فیملی کے لیے ایک چاکلیٹ کیک خریدا اور پرانے شہر کے علاقے میں اس کے گھر جا پہنچے۔ یٰسین فرش پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میں نے دل کی تکلیف کا سبب پوچھا۔ اس نے بتایا کہ جب مجھے پہلی بار جیل میں بند کیا گیا تو زہر آلود خون دے دیا گیا۔ بعد ازاں جیل ہی میں اس کا تبدیلیٔ قلب (Heart Transplantation) کا آپریشن کر دیا گیا۔ وہ کافی کمزور نظر آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا اگر آپ ماضی پر نظر ڈالیں تو کیا اس جدوجہد کے شروع کرنے سے آپ کو پچھتاوا تو نہیں ہوگا۔

یٰسین ملک کا جواب تھا ''پچھتاوے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم عزت، وقار اور عظمت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ نہیں ہے تو پھر ہماری زندگی کس کام کی؟ ایسی زندگی کا کیا فائدہ؟ ہماری یہ جدوجہد جاری رہے گی''۔

بہت سے لوگ خصوصاً انڈین آرمی کے افسر یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ جنگجوئی جن افراد کی مدد سے کی جارہی ہے وہ غیر ملکی ہیں۔ افغانستان، پاکستان اور سعودی عرب سے تعلق رکھنے والے کرائے کے سپاہی۔ کیا یہ درست ہے؟ میرا سوال تھا۔

یٰسین نے جواب دیا'' کچھ لوگ مختلف ملکوں سے آئے ہوئے ہیں لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ اس جدوجہد میں غالب اکثریت ان کی ہے۔ اگر ۱۹۹۱ اور ۱۹۹۲ء پر نظر ڈالی جائے تو جنگجو سڑکوں پر کھلے عام پھرتے تھے۔ اب صورت حال تبدیل ہو چکی ہے۔ بھارت کی حکومت جنگجوؤں کے اہل خانہ کو نشانہ بناتی ہے۔ انہیں بے دردی سے قتل کر دیا جاتا ہے، ان کے گھر بم سے اڑا دیے جاتے ہیں۔ تین مہینے پہلے جترا کنڈ میں بدرو کندنامی ایک جنگجو کے والد کو مقامی آرمی کے بریگیڈئر نے ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا اور کہا کہ وہ اپنے بیٹے کو پیش کرے۔ بے چارے باپ نے بتایا کہ مجھے اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے؟ ہمارا اس کے ساتھ کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ ایسی صورت میں میں اسے کس طرح پیش کر سکتا ہوں؟ بریگیڈئر نے اسے چار دن کی مہلت دی۔ اس دوران اسے دوبارہ بلوا کر پوچھا گیا کہ اس نے اپنے بیٹے کو کیوں پیش نہیں کیا؟ باپ کا جواب تھا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ بریگیڈئر نے اسے پھر چوبیس گھنٹے کی مہلت دی۔ چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد اس کے گھر کو بارود سے اڑا کر سات افراد کو قتل کر دیا گیا۔ اس وقت گھر کے سب لوگ سوئے ہوئے تھے۔ یہاں تو یہ صورت حال ہے۔ بنابریں کشمیری جنگجو کی حیثیت سے اپنی شناخت نہیں کروانا چاہتے، وہ جانتے ہیں کہ ان کے خاندان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔''

میں نے یٰسین کو بتایا کہ انڈین آرمی کے افسروں کو یقین ہے کہ جنگجو کمزور ہیں۔ وہ کشمیر پر قابض چار لاکھ فوجیوں کو کبھی شکست نہیں دے سکتے اور ان کا مقصد محض دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے۔ اس کا جواب تھا'' ہاں انڈین آرمی یہ بات کہتی ہے۔ وہ طاقت و نخوت کے نشے میں چور مبالغہ آمیز دعوے کرتے

ہیں۔ انہیں اپنی طاقت پر گھمنڈ ہے اور اسے نہتے کشمیریوں پر آزمارہے ہیں۔ لیکن ہم یہ جدوجہد جاری رکھیں گے۔ پچھلے آٹھ سالوں میں وہ ہماری قوت ارادی کو متزلزل نہیں کر سکے اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ مستقبل میں بھی ایسا کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ ان کے لیے کشمیر کی سرزمین پر کوئی جگہ نہیں ہے۔''

ماجد اپنا تعلق ایک خفیہ سیاسی جماعت کے ساتھ بتاتا ہے۔ اس جماعت کے نام کا ترجمہ ہے: ''ڈیوڑھی میں بیٹھنے والے جنگجو''۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ لوگ غیر متشدد ہیں اور حق خود ارادیت سے زیادہ نوکریاں چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر شخص کو کام ملنا چاہیے۔ ہر شخص اپنے خاندان کے ساتھ ڈیوڑھی پر بیٹھے۔ لیکن اس نے بتایا کہ اس پارٹی نے اپنے بارے میں ابھی کھلے عام اعلان نہیں کیا اور زیادہ بہتر ہوگا کہ میں اس پارٹی کا تذکرہ نہ کروں اور نہ کسی سے کچھ پوچھوں۔

ہم گاڑی چلاتے ہوئے سری نگر شہر سے باہر نکل کر کشمیر کی شمال مغربی وادی میں پہنچ چکے ہیں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ایک زمانے میں وادی کو پچاسی میل لمبی، چوبیس میل چوڑی اور آٹھ سو فٹ گہری جھیل نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہر طرف کھیت ہیں اور کاشت کا موسم ہے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ سیب اور بھنی ہوئی چھلیاں بک رہی ہیں۔ خواتین کھیتوں میں کام کرنے والے مردوں کے لیے المونیم کی بنی ہوئی گرم چائے کی بڑی بڑی کیتلیاں اپنے سروں پر توازن سے رکھے لیے جارہی ہیں۔ یہاں آپ یہ احساس ہی نہیں کر سکتے کہ کشمیر میں خانہ جنگی ہورہی ہے۔

کھیتوں پر کام کرنے والے یہ مرد جنگجو ہو سکتے ہیں جنہوں نے اپنی مشین گنیں کہیں قریب ہی چھپا رکھی ہیں۔ سروں پر کیتلیاں اٹھا کر لے جانے والی عورتیں بم بنانے میں ماہر ہوسکتی ہیں۔ یہاں ہونے والی جنگ، جنگ سے زیادہ دہشت گردی کا عمل بن گئی ہے۔ باغی پہاڑوں میں جا چھپے ہیں اور انڈین فورسز کے اہل کاروں کو ویت نام میں امریکیوں کی طرح ہر کوئی دشمن نظر آتا ہے۔

میں نے چار صفحوں پر مشتمل روزنامہ ''کشمیر مانیٹر'' کے گزشتہ پچاسی شمارے خرید لیے ہیں۔ یہ سرینگر سے شائع ہونے والا ایک روزنامہ ہے۔ ہر شمارے کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ اخبار کی شہ سرخیاں سانس روک دینے والی اور ناقابل یقین ہیں۔ ''پونچھ گاؤں میں انیس مسلمان بے دردی سے گولیوں سے اڑا دیے گئے''۔ ''لائن آف کنٹرول پر انڈیا اور پاکستان کے درمیان آرٹلری فائرنگ کا تبادلہ''۔ مخفی طور پر

فوج داخل کرنے کی کوشش ناکام بنادی گئی۔ مزید سولہ افراد جان ہار بیٹھے۔'' اخبار میں ۵۵ ملی میٹر کی بوفرز گنوں کی فائر کرتی ہوئی تصویریں چھپی ہوئی ہیں۔ اسی طرح مرے ہوئے جسموں کی ایک لائن میں رکھے، اور بندوقیں تانے ہوئے فوجیوں سے بچ نکلنے کے لیے بھاگتے ہوئے لڑکوں کی تصویریں ہیں۔ ان اخبارات کو پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے پورے ملک میں یا تو آگ لگی ہوئی ہے یا لگنے والی ہے۔

ہم جس پل پر سے بھی گزرے ہیں ماجد بتاتا ہے کہ اس پل کو جنگجوؤں نے بم سے اڑا دیا تھا اور آرمی نے اسے دوبارہ تعمیر کیا ہے۔ ہم جس آبادی سے گزرتے ہیں وہ رنج والم کی ایک نئی داستان سناتی ہے۔ یہاں جنگجوؤں نے سڑک پر بم رکھ دیا تھا۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ بم پھٹا اور سیکورٹی فورسز کا ایک ٹرک تباہ ہوگیا۔ فوجیوں نے گاؤں میں گھروں کو آگ لگادی اور تین مردوں کو قتل کردیا حالانکہ ان کو بم رکھے جانے کی خبر تک نہ تھی۔ اور اگر انہیں خبر ہو جاتی اور وہ سیکورٹی فورسز کو اطلاع دے دیتے تو وہ جنگجوؤں کے ہاتھوں مارے جاتے۔ ہمیشہ غریب لوگ ہی ہر طرف سے پسے جاتے ہیں۔

ہم بارہ مولہ پہنچتے ہیں۔ یہ قصبہ سری نگر کے مغرب میں پچیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ گاڑی ڈسٹرکٹ کمشنر کے احاطہ کے باہر کھڑی کر دیتے ہیں۔ بارہ مولہ بغاوت کا مرکز مشہور ہے۔ احاطہ کوڑا کرکٹ سے بھرا ہوا ہے۔ احاطے کے دائیں بائیں دفاتر، عدالتیں، ماتحت عدالتیں اور سرکاری محکموں کے دفاتر ہیں۔ یہاں بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے نوجوان قیدی ہیں۔ پولیس نے انہیں اس طرح پکڑ رکھا ہے جس طرح کتوں کو پٹے سے پکڑا جاتا ہے۔ یہاں احاطے میں جا بجا بیویاں، باپ اور بھائی اپنے شوہروں، بچوں اور بھائیوں سے ملاقات کے انتظار میں پریشان حال بیٹھے ہیں، جنہیں مقدمہ چلائے بغیر حوالات میں ڈال دیا جائے گا اور پھر تعذیب واذیت دے کر ہر بات کا اعتراف کروالیا جائے گا یہاں تک کہ انہیں اپنی زندگی سے نفرت ہو جائے گی یا پھر وہ اس کے بوجھ سے ہی آزاد ہو جائیں گے۔

میں صحن کے وسط میں رُک کر اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لگتا ہے وقت نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور اب خلا کی وسعتیں ہی کوئی حل نکالیں گی۔ میری ٹانگوں میں سکت نہیں رہی اور سانس رک گیا ہے۔ میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتا ہوں جو بڑے بھاری ہوگئے ہیں۔

اس اولتے بدلتے منظر میں ایک کردار سامنے آتا ہے۔ ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں ملبوس، سفید قمیض اور ٹائی لگائے بالکل ابراہم لنکن لگتا ہے۔ وہ سوچوں میں کھویا آہستہ آہستہ احاطہ پار کر رہا ہے۔ ''معاف کیجیے گا، جناب'' میں اس سے کہتا ہوں۔ وہ نگاہیں اوپر اٹھا کر دیکھتا ہے، اس کی آنکھوں میں حیرت نہیں تھکاوٹ ہے۔ پھر مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہے۔ ہم دروازے میں سے گزر کر ایک تاریک کمرے میں پہنچتے ہیں۔ وہ بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کرتا ہے۔ ''کیا آپ چائے پینا پسند کریں گے''؟

وہ ان جنگجوؤں کا وکیل ہے جنہیں گرفتار کیا گیا ہے۔ صرف بارہ مولہ کی جیل میں کم از کم دو ہزار ایسے افراد قید ہیں۔ وہ بے چین اور مضطرب ہے۔ مقناطیسی لچھے کی طرح پیچ وخم کھا رہا ہے۔ ''میرے کسی موکل پر نہ تو آج تک کوئی باقاعدہ الزام لگایا گیا ہے اور نہ آئندہ لگایا جائے گا۔ انہیں بس پکڑ لیا جاتا ہے اور بعض تو اس قید کے دوران ہی پراسرار طور پر غائب ہو جاتے ہیں۔'' وہ کہتا ہے یہ لوگ بے گناہ ہیں۔ انہیں اپنے دفاع میں ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ وہ میری طرف دیکھتا ہے، اس کی آنکھوں میں شعلوں کی لپک ہے۔ اس کی روح کی آگ اس کے ہونٹوں اور زبان پر دہکتے ہوئے کوئلہ بن گئی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ احتیاط کے ساتھ ایک ایک لفظ الگ الگ ادا کر رہا ہے۔

''آپ یہاں ایٹمی دھماکوں کی وجہ سے آئے ہیں، جنہوں نے بین الاقوامی برادری کو ہماری طرف متوجہ کر دیا ہے، جو نہ صرف برصغیر بلکہ پوری دنیا کے امن کے لیے خطرہ بن چکے ہیں۔'' وہ دانت پیستے ہوئے اپنی بات شروع کرتا ہے۔ ''لیکن ہم کشمیری لوگ حق خودارادیت حاصل کرنے کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہمیں ایسے جرائم کی بنا پر جلایا جا رہا ہے جو ہم نے نہیں کیے۔ ہمیں جیلوں میں ڈالا اور قتل کیا جا رہا ہے۔ ہماری ماؤں اور بہنوں پر اکثر ایسے الزامات کے تحت مجرمانہ حملے کیے جاتے ہیں جو انہوں نے سرے سے کیے ہی نہیں ہوتے۔ میں ایک بات کا اضافہ کرنا چاہوں گا جب کبھی مستقبل میں مذاکرات ہوں تو کشمیریوں کو ان میں شامل کرنے کے لیے لازماً دعوت دی جائے''۔

ہم چائے ختم کرتے ہیں اور دفتر سے نکل آتے ہیں۔ ہم اپنی راہ پر ہو لیتے ہیں اور وکیل دوسری سمت میں۔ وہ اپنا سر جھکائے آہستہ آہستہ واپس جا رہا ہے جیسے اس نے مجھے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ میں یہ سوچتے ہوئے احاطے سے نکل آتا ہوں کہ ہر دوزخ میں ایک ایسا آدمی ضرور ہوتا ہوگا جو شعلوں میں کھڑا

پورے عقلی استدلال کے ساتھ بتاتا ہوگا کہ اپنی جلائی ہوئی آگ کس طرح بجھ سکتی ہے۔ باشعور آدمی جس کے جسم پر ناپ میں بڑے کپڑے ہوں گے اس نے سفید شرٹ زیب تن کی ہوگی اور ٹائی لگا رکھی ہوگی اور شکل میں ابراہم لنکن سے ملتا جلتا ہوگا۔

کار میں ہم تین آدمی ہیں۔ تیسرا ہمارا ترجمان منظور ہے جس کی عمر بیس سال ہے۔ میرا منصوبہ ہے کہ میں لائن آف کنٹرول کے کچھ حصوں کا دورہ بھی کروں۔

کپواڑہ وادی کشمیر کے شمالی کنارے پر واقع ہے۔ پاکستان کے جنوبی علاقے کے ساتھ متصل یہ بستی پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے۔ آبادی زیادہ تر کسانوں پر مشتمل ہے۔ جنگجو، پاکستان اور افغانستان کے ٹریننگ کیمپوں میں تربیت حاصل کرنے کے بعد (انہی کیمپوں میں سے بعض پر امریکہ نے پچھلے اگست میں بمباری کی تھی) کپواڑہ کی وادی میں آتے اور کشمیر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ دو ہفتے قبل یہاں جنگجوؤں اور سیکورٹی فورسز کے درمیان شدید لڑائی ہوئی تھی۔ اس لڑائی میں ایک بھارتی کیپٹن، ایک جوان اور درجن بھر جنگجو مارے گئے تھے۔

کپواڑہ سے پہلے آخری چیک پوسٹ پر کیپٹن ونود مجھ سے پوچھتا ہے ''تم یہاں کیوں آئے ہو''؟ میں اسے بتاتا ہوں کہ میں لوگوں سے مل کر یہ پتہ کرنا چاہتا ہوں کہ جنگجو یہاں کس طرح آ جاتے ہیں، ان میں کتنے کشمیری ہوتے ہیں؟ ''وہ سارے علاقے میں سے گزر کر آ جاتے ہیں اور ہم انہیں قتل کر کے ان کے ہتھیاروں پر قبضہ کر لیتے ہیں۔'' کیپٹن کہتا ہے۔ ''ان میں سے صرف تیس فی صد کشمیری ہوتے ہیں، باقی کا تعلق پاکستان اور افغانستان سے ہوتا ہے اور کچھ کا سوڈان سے۔ وہ کنٹرول لائن پار کر کے آ جاتے ہیں اور ہم انہیں جا لیتے ہیں اور گولی مار دیتے ہیں۔ مزید کیا جاننا چاہتے ہو؟'' کیپٹن کا تعلق راجستھان سے ہے لیکن اس کا انداز انگریزوں کا سا ہے، وہ انگریزی اس طرح بول رہا ہے جیسے یہ اس کی اپنی زبان ہو۔ وہ مجھے یہ احساس دلاتا ہے کہ میں اس کے دائرہ اختیار میں ہوں اور اب یہ اس کی مرضی پر ہے کہ وہ مجھے قصبے میں جانے دے یا کہ نہیں۔ ''کسی سے بھی بات کر لو۔ کپواڑہ میں کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ لیکن قصبے سے آگے نہ جانا۔ دریا پار نہ کرنا وہاں شدید خطرہ ہے۔'' وہ کہتا ہے۔

ہم پھر کار میں بیٹھ جاتے ہیں اور مرکزی مارکیٹ کی طرف ہو لیتے ہیں لیکن یہ تو فوجیوں سے بھری

پڑی ہے۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ قصبے کے آخری کنارے پر پھیلے ہوئے کھیتوں میں جانا چاہیے تاکہ لوگوں سے گفتگو کی جا سکے۔ منظور میری تجویز سن کر سیٹ پر ہی ساکن و جامد رہ جاتا ہے۔ کیپٹن نے منظور کو متنبہ کیا تھا کہ اگر وہ مجھے مارکیٹ سے باہر لے کر گیا تو وہ پیچھا کرتا ہوا آ جائے گا اور اسے گولی سے اڑا دے گا کیونکہ وہ تو انگریز نہیں ہے۔

ہم کھیتوں میں پہنچتے ہیں۔ چائے کا وقفہ ہے، لوگ کام چھوڑ کر چائے پینے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں کچھ لوگوں سے بات چیت کرتا ہوں، لیکن وہ سخت خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں یہ بھی گوارا نہیں کہ میں ان کے پاس کھڑا ہو کر کچھ سوالات ہی کر لوں۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان لوگوں کی تصویریں لینے لگتا ہوں جو چھوٹی چھوٹی درانتیوں سے دھان کی فصل کاٹ کر ان کی گٹھیاں بنا رہے ہیں۔ بعد ازاں یہ گٹھیاں ان کی عورتیں اپنے سروں پر رکھے سڑک تک لے جاتی ہیں۔

میں تصویریں لے رہا تھا کہ ایک نوجوان میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے جو کہانی بیان کی، اس کے مطابق دو ہفتے قبل رونما ہونے والا واقعہ کوئی جھڑپ نہ تھی اور جو لوگ نشانہ بنے ان کا جنگجوؤں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ جگر پورہ کے قریبی دیہاتوں کے رہنے والے عام شہری تھے۔ انیس کے انیس عام شہری تھے۔ ایک شخص تو اسّی نوے برس کے پیٹے میں تھا۔ انہیں قتل کرنے کے بعد فوجیوں نے گاؤں کو نذرِ آتش کر دیا۔ کھیتوں پر شیلنگ کی اور فصلیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیں۔ میں نے اس سے پوچھا: ''کیا ایسا پہلی بار ہوا ہے؟''۔ اس نے جواب دیا ''نہیں ایسا کئی مرتبہ ہو چکا ہے۔ اس قسم کے واقعات میں بہت سے لوگ مارے جا چکے ہیں۔'' قصبے سے واپس آتے ہوئے ہمیں فوجیوں نے سیٹیاں بجا بجا کر روک لیا اور ریڈیو پر کیپٹن ونود سے رابطہ کیا۔ وہ اپنی جیپ دوڑاتا ہوا پہنچا۔ وہ سخت برہم تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہے۔

''تم کہاں گئے تھے؟'' اس نے چیختے ہوئے کہا

''صرف کھیتوں تک''

وہاں تم سے کس نے باتیں کی تھیں؟''

''میں زیادہ تر تصویریں ہی لیتا رہا۔ کوئی شخص بھی مجھ سے بات کرنے کو تیار نہ تھا۔''

قریب تھا کہ منظور کا پیشاب خطا ہو جائے۔ یقیناً مجھے اپنے کیمرے سے ہاتھ دھونا پڑیں گے اور ممکن ہے کہ حالات اس سے بھی بدتر ہو جائیں۔ میں سوچنے لگا۔ لیکن کیپٹن کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور وہ ہمیں جانے دیتا ہے۔

ہم لوگ تو چلے آئے مگر نہ جانے ان غریب لوگوں کا کیا حشر ہوا۔ ہوسکتا ہے کھیتوں میں کام کرنے والے تمام مزدور گرفتار کر لیے گئے ہوں اور انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہوتا کہ وہ اس شخص کے بارے میں اطلاع دے دیں جس نے میرے ساتھ گفتگو کی تھی۔ پھر اسے گرفتار کر کے بغیر تفتیش کے گولی مار دی گئی ہو۔ یہ سب کچھ ممکن تھا۔ یہاں ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔

ہم وادی سے نکل کر مشرق میں کنٹرول لائن کے پاس ایک ایسی جگہ جا پہنچتے ہیں جہاں جنگجوؤں کا عمل دخل تو کم ہے لیکن پاکستان اور بھارت کے فوجیوں میں جنگ ہو رہی ہے۔ پچھلے دو مہینے سے یہاں بمباری ہو رہی ہے۔ پاکستانی پہاڑوں میں بہت اونچی جگہ پوزیشن لیے شیلنگ کر رہے ہیں۔ گولے بادلوں میں سے گزر کر نیچے کشمیر میں گر رہے ہیں۔ ہزاروں افراد کارگل میں اتر گئے ہیں اور انہوں نے وہاں پر موجود ساٹھ سے زیادہ افراد کو قتل کر دیا ہے۔ ہم اس سڑک پر جا رہے ہیں جو نیچے قصبے میں داخل ہو رہی ہے۔ سڑک کے ایک طرف دو جلے ہوئے ٹرک الٹے پڑے ہیں اور ایک نیچے دریا میں گرا ہوا ہے۔ مزید چند کلومیٹر آگے ہمیں دریا اور سڑک کے درمیان بھارت کی بوفرز توپیں، ریت کی بوریوں کے پشتے اور کیموفلاژ نظر آتے ہیں۔ یہ سب اہتمام پاکستانیوں کے حملوں کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے کیا گیا ہے۔ پاکستان اور بھارت دونوں کے آرٹلری یونٹوں نے صرف فوجی اہداف کو نشانہ بنانا چھوڑ دیا ہے۔ شہریوں کو مار دینا آسان بھی ہے اور پیشہ ورانہ صورت میں نفع کا سودا بھی۔ کہتے ہیں اس قسم کے اکثر واقعات آئے دن پریس میں آتے رہتے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق یہی کچھ سارے فریق چاہتے بھی ہیں۔

میں ماجد سے پوچھتا ہوں کہ اس کا کیا خیال ہے، کشمیر کا کیا بنے گا؟ وہ جواب دیتا ہے میں کچھ نہیں جانتا صرف خدا جانتا ہے۔ خدا ہی کو ہر بات کی خبر ہے۔

میں کہتا ہوں اگر خدا ہر بات جانتا ہے اور ہر چیز پر اختیار رکھتا ہے تو پھر وہ کشمیریوں کو کیوں سزا دے

رہا ہے؟ صرف خدا ہی کو ان باتوں کا علم ہے۔ ہم نے نو سال بہت ظلم سہے ہیں۔ بہت سے لوگ توپوں کا چارہ بن گئے ہیں۔ بے شک ہمارے لیے نو سال کا عرصہ لمبا عرصہ ہے مگر خدا کے لیے اس کی کوئی حیثیت نہیں، یہ مدت اس کے لیے بہت معمولی چیز ہے۔''

ہم قصبے کے پرانے حصے سے گزرتے ہوئے واپس سری نگر پہنچتے ہیں۔ مسلمان نماز ادا کر رہے ہیں۔ ان کی التجاؤں اور گریہ وزاری کی آوازیں سپیکروں سے آ رہی ہیں۔

''اے اللہ میری سن لے، اے اللہ میں تیری بارگاہ میں ملتمس ہوں، میری سن لے۔ اے اللہ میں تیرے حضور دست بدعا ہوں، اے اللہ میری فریاد سن لے۔''

ہم تنگ گزرگاہوں کے جال میں سے پیچ وخم کھاتے اور ہارن بجاتے گزر رہے ہیں جہاں پر برسہا برس کی دہشت اور بے سکونی نے ہر شخص کو سردرد اور سخت مزاجی کا شکار بنا دیا ہے۔ ہر شخص بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے اور انتظار کر رہا ہے کہ خدا ان کی دعائیں سنے گا اور ان کی مدد کرے گا۔